© rasailojaraid.com

عہدِ اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے ذرائع

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

یہ بڑی خوش آیند بات ہے کہ ادھر کچھ عرصہ سے مدارس کے نظامِ تعلیم و تربیت پر غور و فکر اور ان کے نصاب کی اصلاح کے بارے میں اظہار خیال کا سلسلہ کافی بڑھ گیا ہے۔ سیمیناروں اور مذاکرات میں یہ ایک اہم اور دلچسپ موضوع بن گیا ہے اور اس کے ساتھ کتب و رسائل اور مجلات و جرائد میں بھی اس موضوع پر نگارشات بکثرت شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان تمام ذہنی و فکری اور تقریری و تحریری کاوشوں سے نہ صرف یہ کہ اس مسئلہ (مسلمانوں کی تعلیمی حالت کی بہتری) کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے بلکہ اس کے بارے میں مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے احساس کی کھلی ہوئی شہادت بھی ملتی ہے۔ اس بڑھتے ہوئے احساس کے دو خاص اسباب نظر آتے ہیں: اول یہ کہ نئے حالات میں اسلام کی بہتر و موثر ترجمانی، ملت کی رہنمائی اور اس کو درپیش مسائل کے حل کے لیے ایسے افراد کی سخت ضرورت ہے جو اسلام کے اساسی علوم میں مہارت کے ساتھ عصری علوم سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے ہوں یا بالفاظ دیگر جو تعلیم کے قدیم و جدید دونوں دھاراؤں کے سنگم ثابت ہوں۔ دوسرے یہ کہ موجودہ دور میں معاش سے تعلیم کا رشتہ دن بہ دن گہرا ہوتا جا رہا ہے اور معاش کے لیے تحصیلِ علم کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ گرچہ یہ رجحان اسلام کے تصور علم سے میل نہیں کھاتا لیکن عصر حاضر کے حیران کن اور پیچیدہ معاشرتی و معاشی مسائل کی وجہ سے مسلمان بھی اس سے اپنے آپ کو دور نہیں رکھ سکتے۔ انہی حالات و مسائل کے تحت بار بار اس ضرورت کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ دینی و ملی تقاضوں اور عصری مطالبات کو سامنے رکھ کر مدارس میں ایسا نظامِ تعلیم تشکیل دیا جائے اور اس انداز کا نصاب مرتب کیا جائے کہ اس سے فیض یاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہونے والے دین مبین کے بہترین ترجمان بن سکیں اور معاشرتی و معاشی تقاضوں کو بھی خوش اسلوبی سے پورا کرسکیں۔ اسی ضمن میں یہ خیال بھی بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں مسلم ملکوں اور خود ہندوستان میں مدارس کی تعلیم اور مروجہ درسیات سے فائدہ اٹھا کر طلبہ مختلف علوم و فنون کے ماہر بن کر نکلتے تھے جو تفسیر، حدیث و فقہ کے ساتھ ریاضی، کیمیا، طب، فلسفہ و علم ہیئت سے بھی بہرور ہوتے تھے لیکن آج کے مدارس اس طرح کے افراد نہیں پیدا کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ ایک یہ کہ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اس زمانہ کے تمام تعلیم یافتہ علم کے میدان میں اس جامعیت سے متصف ہوتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اسے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کیا اس وقت تعلیم کے ذرائع اور درس و تدریس کے طریقے وہی تھے جو آج معمول بہ ہیں؟ کیا اس زمانہ میں بھی علوم و فنون کی بے شمار انواع و اقسام یا ان کی شاخ در شاخ تقسیم پائی جاتی تھی جیسا کہ موجودہ دور میں دیکھنے میں تی ہے؟ کیا اُس عہد میں اسلامی علوم و فنون اور دوسرے علوم کے مضامین کے درس و رریس کے نہج میں وہ بیّن و واضح فرق موجود تھا جو آج ہم سب کے سامنے ہے؟ کیا اس دور کے مسلمانوں کو بھی اس ملک میں دوہرا نظامِ تعلیم کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جس سے وہ اِس وقت بری طرح دوچار ہیں؟ اِن تمام سوالات پر گہرائی سے غور و خوض کیے بغیر عہدِ اسلامی کے ہندوستان کی مروجہ تعلیم اور آج کل کے مدارس کی تعلیم میں موازنہ کرنا اور پھر اس کی روشنی میں ان کے نظام یا نصابِ تعلیم میں اصلاح و ترمیم کی بات کرنا صحیح نہ ہوگا، بیک وقت اِن تمام سوالات پر کسی ایک مضمون میں غور و خوض یا تشفی بخش طور پر ان کا جواب دینا مشکل ہے۔ اس لیے سرِدست پیشِ نظر مضمون میں صرف اس سوال پر غور و خوض مقصود ہے کہ عہدِ اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے کیا خاص ذرائع تھے۔ کیا ایک شخص کسی ایک مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہو کر یا کسی مقررہ نصاب کو مکمل کر کے مختلف علوم و فنون کا ماہر بن جاتا تھا یا اصل صورتحال کچھ اور تھی؟

موضوعِ بحث پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ عہدِ اسلامی کے ہندوستان میں تعلیم کے کون کون سے مراحل تھے اور مراحل کی یہ تقسیم کس بنیاد پر قائم تھی؟ معاصر مآخذ میں دستیاب معلومات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج کل کی طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس وقت نہ تو جماعات کی تقسیم تھی اور نہ درجات کی حد بندی، اُس عہد میں درس و تدریس کے نظام پر پوری طرح کتابی انداز غالب تھا۔ اس لیے اگر تعلیم کے مختلف مراحل کی تعیین کی جاسکتی ہے تو وہ درسیات ہی کی بنیاد پر ممکن ہے۔ نوعیت یا معیار کے اعتبار سے درسیات کی الگ الگ قسمیں تھیں اور ایک قسم کی درسیات ختم کرنے کے بعد حسب خواہش دوسری کی تکمیل میں مصروف ہو جانا اس وقت کی عام روایت تھی۔ بعض لوگوں نے اُس زمانے کے تعلیمی مراحل کو موجودہ دور کی معروف اصطلاح کے مطابق "ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ" تین حصوں میں تقسیم کیا ہے [۱] لیکن معاصر مآخذ میں تعلیم کی مرحلہ جاتی تقسیم کی یہ اصطلاحیں نہیں ملتیں۔ اس زمانہ کی بعض کتابوں اور علماء و صوفیا کے تذکروں میں تعلیم کے ضمن میں "علم فضل" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے [۲] اور اسی کو عام طور پر اعلیٰ تعلیم کے مرحلہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے قبل کے مرحلہ کے لیے کتابوں میں کوئی خاص اصطلاح نہیں ملتی لیکن لفظ "فضل" کے معنی و مفہوم کی روشنی میں بعض جدید دانشوروں نے اسے "علم ضروری" کا نام دیا ہے اور یہ خیال پیش کیا ہے کہ "علم فضل" سے پہلے جو کچھ حاصل کیا جاتا تھا وہ علم ضروری کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی تکمیل کرنے والے "دانشمند" کہلاتے تھے [۳]۔ یہاں یہ وضاحت بھی بے موقع نہ ہوگی کہ عہد وسطیٰ کے تعلیمی مراحل کے سلسلہ میں "علم ضروری" و "علم فضل" پر جدید دور میں سب سے پہلے مولانا سید مناظر احسن گیلانی (مصنفِ "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت") نے تفصیل سے اظہار خیال کیا تھا۔ بعد میں اس سے متعلق جو کچھ لکھا گیا وہ زیادہ تر انہی کے خیالات پر مبنی ہے [۴]۔

جہاں تک اعلیٰ تعلیم کے ذرائع کا تعلق ہے عام طور پر اس کا سب سے معروف و اہم ذریعہ مدرسہ کو سمجھا جاتا ہے۔ لیکن عہد وسطیٰ کے ہندوستان سے متعلق اس ضمن میں سب سے زیادہ اہمیت تدریس کے انفرادی مراکز کو حاصل تھی اور اسی کے ساتھ ان ذرائع میں کتب خانے، علمی مجالس اور تجربہ گاہوں کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے قدیم روایت کے مطابق مدارس کے قیام اور علم کی اشاعت میں بھرپور دلچسپی لی۔ یہ سلسلہ قیام سلطنت کے اوّلین دور سے شروع ہوا تو اس کے استحکام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وتوسیع کے ساتھ ترقی کرتا چلا گیا۔ ان کے قیام وانصرام میں سلاطین کی ذاتی توجہ اور دلچسپی اور معارف پروری کا کافی دخل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کثیر تعداد میں مدارس کے قیام کا ثبوت ملتا ہے[۵] ایک عرب مورخ وسیاح القلقشندی نے سلطان محمد بن تغلق کے عہد کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ اس وقت صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے پائے جاتے تھے[۶] سلطان فیروز شاہ تغلق سے متعلق مورخین یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اس کے دور حکومت میں تیس نئے مدرسے قائم ہوئے[۷] گرچہ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ عہد سلطنت یا بعد کے زمانہ میں جتنے مدارس قائم ہوئے ان سب میں اعلیٰ تعلیم کا اہتمام تھا لیکن ان میں کچھ ایسے ضرور تھے جن میں اس نوع کی تعلیم جاری تھی جیسا کہ بعض مدارس کی درسیات اور ان میں مقرر کیے جانے والے اساتذہ کے بارے میں تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ اس ضمن میں خاص طور سے سلطان التمتش، علاء الدین خلجی، فیروز شاہ تغلق، سکندر لودی، مظفر شاہ گجراتی، ابراہیم شرقی (شرقی سلطنت، جونپور) محمود گاواں بہمنی سلطنت۔ دکن) کے عہد کے بعض مدارس کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر عہد فیروز شاہی کے اہم مدارس کی درسیات میں تفسیر حدیث وفقہ کے ساتھ علم کلام، علم المناظر علم ریاضی، علم طب وغیرہ کا واضح ذکر ملتا ہے[۸] اسی مدرسہ کے استاد اور پرنسپل مولانا جلال الدین رومی کے بارے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ تفسیر کے زبردست عالم، حدیث کے ماہر اور فقہ کے مذاہب اربعہ پر عبور رکھتے تھے[۹] اسی عہد کے ایک دوسرے مدرسہ (جو سیری کے قصر شاہی میں قائم تھا) کے ایک استاد مولانا نجم الدین سمرقندی سے متعلق معاصر مورخ ضیاء الدین برنی نے یہ ذکر کیا ہے کہ وہ "نوادر اساتذہ" میں سے تھے[۱۰] مزید براں اس عہد کے سلاطین نے بیرون ہند سے آنے والے ماہرین علوم کی جس طرح حوصلہ افزائی کی اور ان میں سے کچھ کو مدارس میں تدریسی خدمات پر مامور کیا اور اس کے ساتھ مرکزی ایشیا کے بعض ممتاز علماء وفضلاء کو ہندوستان بلانے میں انھوں نے جس گہری دلچسپی کا ثبوت دیا ان سب سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ذریعہ مختلف علوم وفنون کی اشاعت اور اعلیٰ سطح کی تعلیم کا فروغ مطلوب تھا۔ سلطان محمد بن تغلق نے فقہ کے ماہرین شیخ برہان الدین ساغرجی اور قاضی مجد الدین کو سمرقند وشیراز (بالترتیب) سے ہندوستان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لانے کے لیے سفر کے اخراجات اور تحائف کے ساتھ اپنے خصوصی ایلچی روانہ کئے تھے[11] اور اسی سلطان نے مولانا معین الدین عمران کے توسط سے علم کلام کے ماہر ایک شیرازی عالم قاضی عضد کو بھی ہندوستان بلانے کا خصوصی اہتمام کیا تھا[12]۔ گرچہ یہ حضرات بعض وجوہ سے ہندوستان نہ آسکے سلطان بلبن کے بیٹے شہزادہ محمد (جو علم وفن میں دلچسپی کے لیے کافی معروف تھے) نے شیراز سے شیخ سعدی کو ہندوستان لانے کے لیے دوبار اپنے مخصوص ایلچی مع اخراجات سفر وتحائف روانہ کیے تھے لیکن پیرانہ سالی کی وجہ سے شیخ نے یہاں آنے سے معذوری ظاہر کی مگر دونوں بار اپنے ہاتھ سے اشعار لکھ کر شہزادہ کو تحفۃً بھیجے تھے[13]۔ مزید براں اس زمانہ کی تاریخی کتب میں ایک دو نہیں متعدد مثالیں اس بات کی مل جائیں گی کہ بیرون ہند سے آنے والے ماہرین علوم وفنون کی خدمات مدارس کے لیے حاصل کی گئیں اور انھوں نے اپنی دلچسپی کے میدان میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ میں گہری دلچسپی دکھائی[14]

مدارس کی کثرت اور ان کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں حکومت اور اساتذہ کی دلچسپی کی مذکورہ مثالوں کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں اعلیٰ تعلیم یا کسی مضمون میں اختصاص کے حصول میں سب سے نمایاں رول تدریس کے انفرادی مراکز یا علماء کی مجلسوں کا نظر آتا ہے اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ معاصر علماء وفضلاء کی تعلیمی زندگی کی تفصیلات میں مدارس سے تعلیم حاصل کرنے یا ان سے فراغت پانے کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ بلکہ عام طور پر ان اساتذہ کا ذکر آتا ہے جن سے انھوں نے درسی کتب پڑھیں یا مختلف علوم وفنون حاصل کیے کسی استاد سے حدیث کا درس لینے کا ذکر ملتا ہے تو کسی سے فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کا اور کسی تیسرے سے علوم عقلیہ کے باب میں فیض یاب ہونے کا۔ اس طرح جو علماء تدریسی خدمات میں مصروف تھے ان کے ضمن میں یہ صراحت کم ملتی ہے کہ وہ فلاں مدرسہ میں استاد تھے بلکہ اس امر کے اظہار پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ وہ کن کتابوں کی تدریس میں مہارت رکھتے تھے یا کون سے مضامین پڑھاتے تھے یا ان مقامات کا ذکر کیا جاتا ہے جہاں وہ بساطِ تدریس بچھائے ہوئے تھے ان سب سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ اس عہد میں تعلیم کے اعلیٰ مرحلہ کی تکمیل میں مدارس سے زیادہ اہمیت علماء واساتذۂ فنون کے انفرادی مراکز کو حاصل تھی جہاں تک مدارس اور تعلیمی اداروں کا تعلق ہے ان میں ایک عام سطح تک مروجہ مضامین کی تعلیم کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ جیسے زیادہ سے زیادہ دانشمند یا مولوی کی سطح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تعلیم کہی جا سکتی ہے۔ باقی اس سے آگے بڑھ کر کسی خاص مضمون میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اس فن کے اساتذہ سے انفرادی طور پر رجوع کرنے یا ان کے حلقہ درس میں شریک ہونے کا طریقہ زیادہ معروف و مقبول تھا اور یہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عہد وسطیٰ میں مسلم ممالک میں عام طور پر یہی طریقہ معمول بہ تھا۔ یہاں صرف ایک مثال دینا کافی ہوگا۔ ۱۶ویں صدی عیسوی کے ایک بدخشانی عالم ملا محمد فاضل نے بدخشاں میں ابتدائی تعلیم کے بعد کابل میں ملا صادق حلوائی سے کسب فیض کیا پھر توران میں ملا مرزا جان شیرازی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور آخر میں لاہور کا سفر کر کے ملا محمد یوسف سے عقلی علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی اور پھر ہندوستان ہی میں مستقلاً سکونت پذیر ہو گئے[۱۵] مورخین و تذکرہ نگاروں کے بیانات سے عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی بابت بھی یہی ثبوت ملتا ہے کہ اس زمانہ میں طلبہ و شائقین علم کو علوم و فنون کے مختلف میدانوں میں نامور و ممتاز اساتذہ سے استفادہ کے لیے مختلف مقامات پر جانا پڑتا تھا اور اس راہ میں بیرونی ممالک کے سفر کی صعوبتیں بھی حائل نہیں ہوتی تھیں۔ صاحب "ماٰثر الکرام" نے طلب علم کی اس روایت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے "طلبۂ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند و ہر جا موافقت دست دہد بہ تحصیل مشغول می شوند"[۱۶] جہاں تک عرب ممالک جا کر وہاں کے اساتذہ سے استفادہ کا تعلق ہے، علم حدیث کے تعلق سے اس نوع کی زیادہ مثالیں ملتی ہیں گرچہ ہندوستان میں مسلم حکومت کے اولین دور میں بھی حصول علم کے لیے ہندوستانی طلبہ کے بیرونی سفر کی مثالوں کی کمی نہیں ہے لیکن مغل دور میں اس نوع کی مثالیں بکثرت دستیاب ہیں۔ عہد سلطنت کے ممتاز محدث شیخ حسن بن محمد صغانی لاہوری (م ۱۲۵۲ء) نے لاہور میں مروجہ درسیات کی تکمیل کے بعد غزنین، عراق و حجاز کا سفر کیا اور آخر الذکر دونوں مقامات پر خاص طور سے علماء حدیث سے استفادہ کیا۔ انھوں نے حدیث کی مشہور کتاب مشارق الانوار بغداد میں قیام کے دوران مرتب کی۔ گرچہ وہ اس کے بعد ہندوستان کئی بار آئے اور طویل عرصہ تک یہاں مقیم رہے لیکن آخر عمر میں وہ بغداد ہی میں تھے کہ وہیں ان کا انتقال ہوا[۱۷]۔ عہد سلطنت کے ہی ایک دوسرے عالم شیخ محمد بن محمد صغانی (م ۱۳۰۸ء) تھے جو ضیاء الدین الہندی کے لقب سے مشہور تھے۔ حدیث کی تعلیم انھوں نے قاہرہ و حجاز جا کر مکمل کی۔ مدینہ منورہ میں انھوں نے دیگر علماء سے استفادہ کے علاوہ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وقت کے ممتاز محدث شیخ علی بن قطب مکرم سے موطا کا درس لیا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے پہلے مدینہ منورہ اور پھر مکۃ المکرمہ میں درس و افادہ کا سلسلہ قائم رکھا اور ان کی وفات بھی اسی پاک سرزمین میں ہوئی۔[۱۸] اس کے علاوہ اس زمانہ میں ایسے علماء وفضلاء بھی تھے جو عرب ممالک کے محدثین سے استفادہ کے بعد ہندوستان واپس ہوئے اور یہیں تدریسی و تصنیفی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (م ۱۲۶۷ء) نے بخارا میں تقریباً ۸ سال اور حجاز میں ۵ سال مقیم رہ کر وہاں کے علماء حدیث سے استفادہ کیا جن میں مدینہ کے مشہور محدث شیخ کمال الدین محمد یمانی بھی شامل تھے۔[۱۹] ۱۴ ویں صدی عیسوی کے ہندوستانی عالم شیخ محمود بن یوسف علی الکرانی الہندی نے مکہ کے جن اساتذہ حدیث سے رجوع کیا ان میں رضی الطبری، زین الطبری، جمال المطہری اور شیخ خلیل مالکی کا نام ملتا ہے۔[۲۰]

یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حدیث کے علاوہ دوسرے علوم کے میدان میں بھی بیرونی علماء سے یہاں کے شائقین علم کے استفادہ کا ثبوت ملتا ہے شیخ ابو حفص عمر بن اسحاق غزنوی (م ۱۳۶۱ء) نے دہلی میں فقہ و دیگر علوم کی تحصیل کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کی اور وہاں قیام کے دوران انھوں نے متعدد علماء کے درس میں شرکت اور اس عرصہ میں شیخ خضر و شیخ رباط سدرہ سے عوارف المعارف کا سماع کیا۔[۲۱] اسی طرح مشہور سہروردی صوفی و عالم مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے تعلیمی مراحل کی تکمیل کے لیے حجاز و مصر کا سفر کیا قیام مدینہ کے دوران انھوں نے عفیف عبد اللہ مطری سے عوارف المعارف کا درس لیا۔[۲۲] اسی کے ساتھ ساتھ علوم عقلیہ کے میدان میں مہارت کے حصول کے لیے بھی بعض علماء نے دوسرے ملکوں کا سفر کیا اور وہاں کے علماء سے استفادہ کیا۔ ملا عبد اللہ تلنبی اور عزیز اللہ تلنبی کے بارے میں یہ معروف ہے کہ وہ علوم عقلیہ کے زبردست ماہر تھے اور انھیں کے توسط سے شمالی ہند میں عقلی علوم کو رواج ملا۔ لیکن یہ بات کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگی کہ انھوں نے ملتان میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایران کا رخ کیا اور وہاں ماہر معقولات ملا یزدی سے استفادہ کیا۔ ایران سے ملتان واپسی کے بعد عرصہ بعد ایک بھائی نے دہلی میں اور دوسرے نے سنبھل میں سکونت اختیار کی اور علوم عقلیہ کی ترویج کو اپنا مشغلہ بنایا۔[۲۳] عہد وسطیٰ کے ہندوستانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علماء کے تعلیمی مراحل کی یہ چند مثالیں بطور نمونہ ذکر کی گئیں۔ مزید تفصیل میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں لیکن انھی چند مثالوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس زمانہ میں عام طور پر مختلف علوم کے لیے مختلف اساتذہ سے رجوع کرنے اور بالخصوص اعلیٰ تعلیم یا کسی فن میں حصولِ اختصاص کے لیے مدارس کے بجائے علماء کے انفرادی مراکز سے فائدہ اٹھانے کا رواج تھا۔ تاہم ایک ہی استاد سے جملہ درسیات کی تکمیل کی بھی کچھ مثالیں ملتی ہیں۔ مولانا قاسم بن عمر دہلوی مصنف لطائف التفسیر نے ایک ہی استاد (مولانا جلال الدین دہلوی) سے جملہ درسیات (تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ وغیرہ) کی تکمیل کی[۲۴] شیخ علاء الدین اندی (م ۱۳۷۵ء) نے تمام علوم متداولہ شیخ معین الدین عمرانی سے حاصل کیے۔ البتہ طریقت کی تعلیم و تربیت کے لیے شیخ نصیر الدین چراغ دہلی سے رجوع کیا۔[۲۵] اسی طرح سید جلال بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے اول تا آخر جملہ کتبِ درسیہ قاضی بہاء الدین روچی سے پڑھیں۔ تصوف کے میدان میں ان کے خاص استاد عفیف الدین عبداللہ مطری رہے ہیں۔[۲۶] بعد کے زمانہ میں ممتاز عالم و مصنف مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اوّل تا آخر تمام درسی کتب سید محمد طفیل اترولوی سے پڑھیں۔[۲۷] مزید براں اس عہد کے متعدد علماء کے بارے میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ وہ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا درس دیتے تھے۔

تعلیم کے انفرادی مراکز کے ذکر میں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ان کے ذریعہ درس و تدریس کے سلسلہ کے رواج پانے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اُس زمانہ میں تدریسی مشغلہ کو دین کی خدمت اور علم کی اشاعت کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے علماء کے حلقہ میں اس کام میں عام طور پر دلچسپی پائی جاتی تھی۔ اُن میں جو آسودہ و فارغ البال ہوتے تھے وہ پورے سکون و اطمینان کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیتے تھے، دوسرے ایسے علماء کی بھی کمی نہ تھی جو عملی زندگی میں کسی دوسرے مشغلہ کو اختیار کرنے کے باوجود درس و تدریس کے لیے بھی اپنے اوقات فارغ کرتے تھے اور پوری دلچسپی اور لگن کے ساتھ علم کی اشاعت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ تیسرے وہ علماء تھے جنھیں سلاطین و ملوک ان کی تدریسی خدمات کے عوض نقد یا اراضی کی صورت میں عطایا سے نوازتے تھے[۲۸] اور وہ بھی پوری دلجمعی سے اس کام میں مصروف رہتے تھے بلکہ بعض اوقات سلاطین خود علماء کو مختلف مقامات پر تدریسی خدمات کے لیے مامور کرتے تھے اور ان کے لیے روزینے یا وظائف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاری کرتے تھے جیسا کہ ان کے فرامین کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔[۲۹] اس زمانہ کے علماء، درس وتدریس سے جو گہرا شغف رکھتے تھے اس کا بخوبی اندازہ ان کے حالاتِ زندگی کے مطالعہ سے بھی ہوتا ہے ایک دو نہیں سیکڑوں علماء کے تذکرہ میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ وہ تمام عمر درس وتدریس میں مصروف رہے یا ان کا بیشتر وقت درس وتدریس میں بسر ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ اُن سے فیض یاب ہونے والوں کا بیان اس انداز میں ملتا ہے کہ خلق کثیر نے ان سے فائدہ اٹھایا یا بے شمار تشنگان علم نے ان سے اپنی پیاس بجھائی۔ متعدد اساتذہ ایسے گذرے ہیں جو نصف صدی سے زائد عرصہ تک مسند تدریس پر متمکن رہے۔[۳۰]

مزید براں اُس عہد میں درس وتدریس کے ذریعہ علم کی اشاعت کی روایت اتنی مستحکم تھی کہ بہت سے علمی ذوق رکھنے والے اپنی سرکاری وانتظامی یا دوسری قسم کی مصروفیات کے ساتھ اس کام میں بھی اپنی دلچسپی جاری رکھتے تھے۔ شیخ فرید الدین شافعی اودھی سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز تھے۔ اس ذمہ داری کو انجام دینے کے ساتھ وہ بڑی پابندی کے ساتھ تفسیر کا درس بھی دیتے تھے۔[۳۱] انہی کے ہم عصروں میں قاضی عبداللہ بیانوی بیانہ میں قضا کے عہدہ پر مامور تھے اور وہاں وہ درس وتدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔[۳۲] عہد بلبن کے ایک اہم افسر حکومت خواجہ شمس الملک سے بھی طلبہ کو درس دینے کی روایت منسوب کی جاتی ہے وہ خاص طور سے عربی ادب کے درس کے لیے معروف تھے۔[۳۳] بہمنی خاندان کے ایک معروف سلطان فیروز شاہ (۱۳۹۷-۱۴۲۲ء) اپنی سیاسی وانتظامی ذمہ داریوں کو انجام دینے کے ساتھ ہفتہ میں تین روز طلبہ کو درس بھی دیتے تھے۔[۳۴] مآثر الامراء کے مصنف کے بیان کے مطابق عہد اکبری میں لاہور کے گورنر قلیچ خاں علوم اسلامیہ کی اشاعت میں کافی دلچسپی رکھتے تھے اور وہ ایک مقامی مدرسہ میں بعض اوقات طلبہ کو تفسیر، حدیث وفقہ کا درس بھی دیتے تھے۔[۳۵] اسی عہد کے مشہور وزیر وماہر معقولات میر فتح اللہ شیرازی اپنی تدریسی خدمات کے لیے بہت معروف ہیں۔[۳۶]

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ خود اپنی دلچسپی سے یا علم کی خدمت کے طور پر درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کرنے والے یا حکومت کے وظائف وعطایا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ساتھ اس کام میں مصروف رہنے والے باقاعدہ کسی مدرسہ یا تعلیمی ادارہ کے پابند نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنی سہولت وافادۂ عام کے نقطۂ نظر سے کسی بھی مقام پر یہ خدمت انجام دے سکتے تھے۔ کہیں مسجد یا کسی استاد کا اپنا گھر مدرسہ بن جاتا تو کہیں شاہی دربار یا امراء کی حویلی اور ڈیوڑھی میں پڑھنے پڑھانے کا ماحول گرم ہو جاتا بعض اوقات خانقاہ یا اس سے متصل کسی عمارت میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہو جاتا تھا۔ عہد فیروز شاہی کے ایک عالم و ماہر درسیات مولانا نجم الدین سمرقندی کے درس کا مرکز سلطان کا تعمیر کردہ قصر بالابند سیری (شاہی محل، دہلی) تھا اور یہی ایک طرح سے ان کا مدرسہ بن گیا تھا جس سے کثیر تعداد میں لوگ مستفید ہوئے۔[۳۷] محمد بن تغلق کے معاصر اور فقہ کے ماہر مولانا فخرالدین زرادی فقہ کے درس میں کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے بعد بیشتر اوقات ان کی خانقاہ میں گذارنے لگے۔ مگر وہاں بھی ان کا یہ مشغلہ جاری رہا۔ خانقاہ سے متصل ہی ایک عمارت میں وہ نماز چاشت کے بعد ہدایہ کا درس دیتے تھے صاحب سیر الاولیاء کے بیان کے مطابق بہت سے لوگ ان کے درس میں شریک ہوتے تھے اور وہ خود بھی اس سے مستفید ہوئے۔[۳۸] اس کے علاوہ عہد مغلیہ کے متعدد علماء وصوفیاء کے بارے میں یہ شہادت ملتی ہے کہ وہ کسی خانقاہ یا پیر و مرشد کی صحبت میں رہتے ہوئے روزانہ کچھ وقت درس و تدریس کے لیے بھی وقف کرتے تھے زیر درس کتابوں میں تصوف کے علاوہ تفسیر و حدیث کی درسیات بھی شامل ہوتی تھیں یہ اور بات ہے کہ وہ تفسیر کی انہی کتابوں کا درس دیتے تھے جو صوفی حلقوں میں مقبول ہوتی تھیں مثلاً تفسیر مدارک التنزیل وعرائس البیان چشتی صوفی خواجہ حسین ناگوری (م ۱۴۹۶ء) شیخ حمید الدین صوفی و شیخ احمد محمد شیبانی (م ۱۵۲۱ء) اول الذکر تفسیر کے درس کے لیے معروف تھے۔[۳۹] مزید براں سلطان سکندر لودی کے ہم عصر و ممتاز محدث سید رفیع الدین صفوی شیرازی (م ۱۵۲۶ء) آگرہ میں ایک مکان میں تقریباً چونتیس برس تک حدیث کا درس دیتے رہے۔ یہ مکان خود سلطان نے ان کے لیے بنوایا تھا اور یہ علم حدیث کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔[۴۰] یہاں اس پر اتنا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے استاد اور مغلیہ سلطنت کے آخری دور کے ممتاز عالم میر طفیل محمد بلگرامی (م ۱۷۳۸ء) نے ایک طویل عرصہ تک بلگرام میں سید محمد فیض زمیندار کی ڈیوڑھی میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درس وافادہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے بعد تقریباً تیس سال تک اسی شہر میں میر عبدالجلیل کے دیوان خانہ میں مسند تدریس پر متمکن رہے۔ مولانا آزاد بلگرامی نے انہی مقامات پر ان سے تمام اعلیٰ درسی کتب پڑھیں[۱۲] مختصر یہ کہ اس زمانہ کے علماء وفضلاء تدریسی خدمت کے لیے کسی مدرسہ یا ادارہ کی عمارت یا اس میں باقاعدہ اپنی تقرری کی قید وبند سے آزاد ہوتے تھے وہ جس مقام کو درس وتدریس کے لیے منتخب کر لیتے وہی ان کا مدرسہ بن جاتا اور علم کے متوالے کھنچ کھنچ کر اس مقام پر پہنچ جاتے تھے اور ان سے استفادہ کرتے تھے۔ ان سے مستفید ہونے والوں میں مختلف مشاغل، طبقات اور سنین کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ یہ اساتذہ یا ماہرین درسیات کسی ادارہ یا مدرسہ کی نسبت کے بجائے کسی خاص فن یا مضمون میں اپنے تدریسی امتیاز کے لیے معروف ہوتے تھے اور طلبہ یا شائقین علم اپنی دلچسپی کے فن کے اعتبار سے اس فن کے استاد کے درس میں شریک ہوتے تھے اور بعض اوقات ایک استاد کے درس سے فارغ ہو کر دوسرے مضمون کے لیے دوسرے عالم کے حلقہ درس سے مستفید ہوتے تھے۔ ان تمام تفصیلات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ عہد زیر بحث میں اعلیٰ تعلیم کا سب سے اہم ومقبول ذریعہ علماء کا مرکز تدریس ہوتا تھا خواہ اس کو ان کے انفرادی مدارس کا نام دیا جائے یا اعلیٰ تعلیمی ادارے سے تعبیر کیا جائے۔

اعلیٰ تعلیم کے فروغ یا کم از کم مطالعہ وتحقیق کے ذوق کو پروان چڑھانے میں مدارس وانفرادی مراکز کے علاوہ علمی محفلوں اور بحث ومباحثہ کی مجلسوں کا بھی حصہ رہا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ اس عہد کے سلاطین وملوک اور بعض امرا بھی علوم وفنون کی اشاعت میں دلچسپی رکھتے تھے اور اہلِ علم وفن کی صحبت کو پسند کرتے تھے۔ اسی لیے ان کا دربار مختلف علوم وفنون کے ماہرین کا مرکز ہوتا تھا۔ ان میں علوم اسلامیہ کے ماہرین شامل ہوتے تھے اور علماء معقولات بھی، شعر وادب کی محفلیں گرمانے والے یہاں ہوتے تھے اور فنونِ لطیفہ کی غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے بھی۔ یہاں نہ صرف یہ کہ انھیں مختلف مسائل پر باہمی تبادلہ خیال کا موقع ملتا تھا بلکہ مختلف علوم وفنون میں دلچسپی رکھنے والوں کی الگ الگ مجلسیں بھی منعقد ہوتی تھیں ان میں آزادانہ ماحول میں بحث ومباحثہ ہوتا تھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور زیر بحث موضوع سے متعلق شرکار کی علمی و فنی کاوشیں اور ان کے نتائج فکر سامنے آتے تھے۔ بعض اوقات سلطان یا بادشاہ خود بھی ان میں شریک ہوتا تھا۔ معاصر مؤرخین کے بیانات سے یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ کسی اہم موضوع پر مباحثہ یا کسی مسئلہ پر شرعی نقطہ نظر سے غور و فکر کے لیے بعض اوقات علما کی مخصوص میٹنگ طلب کی جاتی تھی اور اس میں شاہی دربار کے علاوہ دارالسلطنت اور آس پاس کے ممتاز علما کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی تھی اس نوع کے مباحثہ میں کسی نامور عالم یا شیخ کو صدر یا حکم مقرر کیا جاتا تھا اور وہ اختتام مجلس پر اجتماعی غور و فکر کے ماحصل پر اظہار خیال کرتا تھا۔ اس طرح کی علمی مجالس حکومت کے زیر اہتمام منعقد ہوتی تھیں۔ ان میں سے جو مجلسیں خاص طور سے کسی اختلافی مسئلہ یا نازک معاملہ میں سربرآوردہ علماء و مشائخ کی رائے جاننے کے لیے منعقد کی جاتی تھیں وہ اُس وقت کی اصطلاح میں "محضر" کہلاتی تھیں[62]۔ عہد سلطنت میں متعدد بار حکومت کی زیر نگرانی کچھ در پیش مسائل پر اجتماعی غور و فکر کے لیے علماء وقت کی مجالس کے انعقاد کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں بغاوت کے بعض واقعات[63]، سماع کے تئیں شریعت کا نقطہ نظر[64]، ہندوؤں کے قدیم معابد کا تحفظ[65]، برہمنوں پر جزیہ کا نفاذ[66]، شریعت کے مقررہ محاصل کے علاوہ مزید محاصل کی تنفیذ[67]، بعض مرتد لوگوں اور گمراہ کن فرقوں کے خلاف اقدام[68] جیسے مسائل زیر بحث آئے تھے۔ اس عہد کی علمی مجالس کی نوعیت اور ان کے مباحث کی وسعت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا تھا کہ کبھی کبھی کسی آیت کی تفسیر ہی مذاکرہ کا موضوع بن جاتی تھی۔ گلزار ابرار کے بیان کے مطابق بادشاہ اکبر کے معاصر شیخ منور بن عبدالمجید (م ۱۶۰۳ء) تفسیر و فقہ دونوں میں دلچسپی رکھتے تھے اور مالوہ کے صدر کی حیثیت سے حکومت کی انتظامیہ سے بھی منسلک تھے ایک بار کسی مجلس میں سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۴ (اِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ) سے متعلق امام بیضاوی کی تفسیر زیر بحث آئی بعض علما کو اس پر اعتراض تھا جبکہ شیخ منور اس سے متفق تھے ان کے مشورہ پر بادشاہ نے اس آیت کی تفسیر پر باقاعدہ ایک مجلس مذاکرہ منعقد کی اور اس کی صدارت کے فرائض قاضی صدرالدین لاہوری نے انجام دیئے۔ مباحثہ کے دوران شیخ منور نے اس پر زور و مدلل انداز میں بیضاوی کے نقطہ نظر کا دفاع کیا کہ صدر مجلس نے اختتامی کلمات میں یہ فرمایا کہ آج

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر ناصر الدین بیضاوی زندہ ہوتے تو وہ بھی شیخ منور کی تفسیری مہارت و دقیقہ سنجی کی داد دیتے۔[۵۹] اس زمانہ کے بعض وزراء (جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا) بڑی اچھی علمی صلاحیت کے مالک تھے اور علم کی اشاعت میں دلچسپی بھی لیتے تھے عہد شاہجہانی کے ایسے وزراء میں سعد اللہ خاں وزیر اور دانشمند خاں میر بخشی شامل تھے۔ اسی عہد کا ایک مشہور مباحثہ "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْن" کی تفسیر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے خاص شرکاء ملا عبد الحکیم سیالکوٹی اور دانشمند خاں تھے۔ سعد اللہ خاں اس مباحثہ کے حَکَم مقرر ہوئے تھے[۶۰] بحث و مباحثہ کی ان مجالس کی تفصیلات دستیاب نہیں تاہم ان بکھرے ہوئے مواد سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں وہ دلچسپی و اہمیت سے خالی نہیں ہیں۔ یہاں اس پر اتنا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ حکومت کے زیر اہتمام یا سلاطین و امراء کی زیر نگرانی منعقد ہونے والی ان علمی مجالس و مذاکرات کے علاوہ علماء میں خود اپنے طور پر مختلف مسائل پر اجتماعی غور و فکر اور مباحثہ کا رواج عام تھا۔ اس کے لیے کوئی ثبوت پیش کرنے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ تفسیر و فقہ، شعر و ادب، فلسفہ و منطق یا کسی اور موضوع سے متعلق ان مباحثوں اور مذاکروں سے لوگ وسیع پیمانہ پر مستفید ہوتے تھے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی وجہ سے گہرے مطالعہ و تحقیق کا ذوق فروغ پاتا تھا اور کسی مسئلہ پر شواہد و دلائل کے ساتھ اظہار خیال کی صلاحیت کو جلا ملتی تھی اور یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی بھی میدان میں مہارت کے حصول کے لیے زادِ راہ بنتی ہیں۔

مدارس، انفرادی مراکز اور علمی مجالس کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں یا کسی مضمون میں اختصاص کی راہ میں ایک چیز اور جس کا اس وقت بہت سہارا لیا جاتا تھا وہ ذاتی مطالعہ یا کتابوں سے استفادہ تھا۔ اساتذہ و ماہرین فنون سے رجوع کرنے کے ساتھ ذاتی مطالعہ و تحقیق سے کسی مضمون سے متعلق علم میں وسعت و گہرائی پیدا کرنے کی روایت اُس عہد میں نہ صرف قائم بلکہ بہت مستحکم تھی۔ اس بات کے واضح ثبوت ملتے ہیں کہ طباعت و اشاعت کی موجودہ سہولیات کے فقدان کے باوجود مختلف موضوعات پر ضروری و اہم کتابوں کی کمی نہ تھی۔ ایک دوسرے سے کتابیں مستعار لے کر پڑھنے کے علاوہ اہم کتابوں کی تلاش میں دور دراز کا سفر کرنا بھی کوئی بڑی بات نہ تھی۔ درسی کتب اور ان کی شروح کی نقلیں تیار کرنے میں عام دلچسپی پائی جاتی تھی۔ شائقینِ علم یہ نقلیں خود اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے تیار کرتے تھے اور دوسروں بالخصوص اصدقا، اساتذہ و مشائخ کو ہدیہ کرنے کے لیے بھی۔ شیخ نظام الدین اولیا، کے ایک معتقد رکن الدین جیمرہ کتابت کا شغف بھی رکھتے تھے انھوں نے بہت ساری کتابیں نقل کر کے اپنے مرشد کی خدمت میں پیش کیں۔ ان میں تفسیر کشاف اور مفصل کے نسخے بھی شامل تھے[51] ۸ ویں صدی ہجری کے مولانا زین الدین دہلوی کے بارے میں یہ ذکر ملتا ہے کہ انھوں نے شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کو صحیح مسلم کا ایک نسخہ نذر کیا تھا[52] اس زمانہ کے بعض علما، ایسے بھی ملتے ہیں جو مختلف علوم و فنون کی کتابیں نقل کرتے وقت ان پر اپنی طرف سے شروح و حواشی بھی لکھ دیتے تھے تاکہ مطالعہ کے وقت الگ سے ان کی شروح کو دیکھنے کی ضرورت پیش نہ آئے[53] بعض علما، کی رفتارِ کتابت کا یہ عالم تھا کہ وہ سیکڑوں صفحات کی کتابیں دو تین روز میں نقل کر دیتے تھے[54] اور بعض کے بارے میں یہ ثبوت ملتا ہے کہ ان کی نقل کی ہوئی کتابوں کی تعداد پانچ سو سے بھی زیادہ تھیں[55] کتابوں کی نقلیں تیار کرنے کے سلسلہ میں یہ تو انفرادی کوششوں کا کچھ ذکر تھا۔ اس کے علاوہ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اُس زمانہ میں کتابیں نقل کرنے والوں یا ان کی کاپیاں تیار کرنے والوں کا باقاعدہ ایک طبقہ وجود میں آگیا تھا جو اس کام کو پیشہ کے طور پر اختیار کرتا تھا یہ لوگ وراق یا نساخ کہلاتے تھے۔ یہ لوگ کتابوں کے بارے میں چھان بین کرتے اور معلومات رکھتے تھے کہ کون سی کتابیں کس شہر یا مقام پر کس کے پاس موجود ہیں تاکہ وہ ضرورت کے وقت ان کی نقلیں تیار کر کے شائقین کو فراہم کر سکیں اور یہ لوگ خود اپنے طور پر بھی اہم و معروف کتابوں کی کاپیاں تیار کر کے فروخت کرتے رہتے تھے[56]
عام وراق و نساخ کے علاوہ اس زمانہ میں ماہرین کتابت یا خطاط معتد بہ تعداد میں پائے جاتے تھے۔ سلاطین و امرا، دیگر فنونِ لطیفہ کے ماہرین کے ساتھ خطاطوں کی بھی کافی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور اپنے دربار میں انھیں بھی رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے فن کے مظاہر مختلف النوع تصانیف و تالیفات کی کتابت کی صورت میں سامنے آتے تھے جو خاص طور سے شاہی کتب خانہ کی زینت بنتی تھیں۔ یہ شاہی کتب خانے جو حکومت کی علمی سرگرمیوں کا ایک اہم حصہ ہوتا تھا دوسروں کے استفادہ کا ذریعہ بھی بنتا تھا[57]۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ طویل سفر کے دوران حشم و خدم کے ساتھ یہ کتب خانہ بھی بادشاہ کے ہم رکاب ہوتا تھا جہانگیر نے گجرات کے ایک سفر میں وہاں کے بعض مشائخ کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہی کتب خانہ سے تفسیر حسینی وکشاف کے نسخے بطور ہدیہ پیش کیے تھے[۵۸] سلاطین وامراء کے علاوہ علماء کے اپنے ذاتی کتب خانے یا کتابوں کے ذخیرے بھی ہوتے تھے[۵۹]۔ مختلف موضوعات کی بہترین وقیمتی کتابوں کا جمع کرنا ان کی علمی دلچسپیوں کا ایک خاص حصہ تھا اس دلچسپی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ عہد عالمگیری کے ایک عالم میر سید عبدالجلیل بلگرامی بھکر (سندھ) میں وقائع نویس کے عہدہ پر مامور تھے لیکن اس سے سبکدوشی کے بعد وہ چھ ماہ تک بھکر میں اس لیے رکے رہے کہ انھیں وہاں صحیح بخاری کا ایک اچھا نسخہ دستیاب ہوگیا تھا اور وہ اسے نقل کرنے میں مصروف ہوگئے تھے[۶۰] اُس زمانہ میں مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی کثیر تعداد میں جو نقلیں تیار ہوئیں یا مختلف موضوعات کی جو کتابیں دستیاب تھیں ان کا ہلکا سا اندازہ آج برصغیر ہند و پاک اور برطانیہ کی لائبریریوں وکتب خانوں کے اس ذخیرہ مخطوطات پر نظر ڈالنے سے لگایا جا سکتا ہے جو عہد وسطیٰ کے ہندوستان سے تعلق رکھتا ہے، ہلکا سا اندازہ اس لیے کہ ان مراکز میں صرف وہی مخطوطات پہنچ سکے جو ہندوستان میں مسلم حکومت کے خاتمہ کے بعد کسی طرح سرکاری تحویل میں آئے یا لائے گئے ورنہ جو نسخے انفرادی کتب خانوں اور اہل علم کے گھرانوں سے دستبرد زمانہ یا بعد کی نسل کی اس علمی ورثہ کی ناقدری کی وجہ سے ضائع ہوگئے ان کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

ان سب کے علاوہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مختلف علوم وفنون بالخصوص تفسیر، حدیث وفقہ کی امہات کتب اور اہم مراجع کی دستیابی کا واضح ثبوت اُن کتابوں کے مآخذ و حوالہ جات سے فراہم ہوتا ہے جو اس عہد میں مرتب کی گئیں۔ ان تصانیف وتالیفات میں ایک دو نہیں سیکڑوں کتابوں کے نہ صرف نام بلکہ ان کے اقتباسات بھی ملتے ہیں اس ضمن میں خاص طور سے فتاوائے فیروز شاہی، فتاوائے تاتارخانی اور فتاوائے عالمگیری کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ موخرالذکر دونوں کتابیں متعدد جلدوں پر مشتمل ہیں اور ان کی تالیف وترتیب علماء کی ایک کمیٹی کی نگرانی میں انجام پائی۔ اس کمیٹی کو یہ خاص ہدایت تھی کہ مختلف مسائل پر فقہاء کے مابین جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کی نشاندہی کی جائے اور متقدمین فقہاء کی آراء کو جمع کیا جائے[۶۱] واقعۃً اسی طور پر یہ کتابیں مکمل ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ بغیر کثیر تعداد میں فقہ کی کتابوں کی دستیابی کے یہ اہم کام انجام نہیں پا سکتا تھا۔ یہی طریقہ تفسیر تاتارخانی کی ترتیب سے متعلق بھی اختیار کیا گیا۔ ہر آیت کی تفسیر سے متعلق قدیم مفسرین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی آرار کا استقصار کیا گیا اور ہر اختلافی رائے کو صاحب تفسیر کے حوالے کے ساتھ جمع کیا گیا۔[۶۲] تفسیر و فقہ کی کتابوں کو چھوڑیئے حدیث جس سے متعلق عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اولین دورِ حکومت میں اس میدان میں مطالعہ و درس میں کم دلچسپی لی گئی حتیٰ کہ اس فن کی امہات کتب بھی اس وقت دستیاب نہ تھیں۔ اس کی اہم کتابوں کی بھی اس زمانہ میں کمی نہ تھی۔ اس عہد کے علماء و مصنفین کی تحریروں میں نہ صرف صحاح ستہ بلکہ حدیث کی دوسری کتابوں کے حوالے بھی دستیاب ہیں[۶۳] علوم اسلامیہ کی کتابوں سے قطع نظر اس زمانہ کی تاریخ کی کتابوں میں تفسیر، حدیث و فقہ کے علاوہ دیگر موضوعات سے متعلق کتابوں کے اقتباسات یا حوالے بھی ملتے ہیں (مثلاً تاریخ، طب، منطق و فلسفہ وغیرہ) اس کا مطلب یہ ہے کہ ان موضوعات پر اہم کتابیں بآسانی دستیاب تھیں۔ ان تفصیلات سے یہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں علم کے کسی بھی میدان میں مہارت پیدا کرنے یا اپنی صلاحیت کو جلا بخشنے کے لیے ذاتی مطالعہ و تحقیق کی راہ بھی اپنائی جاتی تھی اس کے لیے کتابوں کی دستیابی میں ممکن ہے کچھ دشواری پیش آتی رہی ہو لیکن یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جو ذاتی مطالعہ و تحقیق کی راہ میں حائل ہوتا تھا۔

اعلیٰ تعلیم کے ذرائع سے متعلق بحث کے آخر میں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ روایتی علوم کے باب میں درس و تدریس اور مطالعہ و تحقیق کی سہولتوں کی فراہمی کے ساتھ بعض عقلی علوم (بالخصوص ہیئت و طب) کے میدان میں تحقیق و تجربہ کی آسانیاں (اگرچہ محدود انداز میں ہی سہی) مہیا تھیں، بعض سلاطین نے ان علوم کے مراکز قائم کرنے میں دلچسپی لی جہاں ماہرین فنون کے علاوہ وہ اسباب و اوزار بھی مہیا کیے جاتے تھے جو تحقیق و تجربہ میں کام آتے تھے۔ اس ضمن میں خاص طور سے سلطان فیروز شاہ بہمنی، سلطان فیروز شاہ تغلق، بادشاہ ہمایوں و شاہجہاں کی کوششوں کو سراہا جاسکتا ہے۔ ان چاروں حکمرانوں کا دربار علم نجوم و ہیئت کے ماہرین کا مرکز تھا۔ فیروز شاہ بہمنی اور شاہجہاں نے بعض معاصر ماہرین ہیئت کی نگرانی میں رصد خانہ کی تعمیر کا کام شروع کیا تھا اگرچہ یہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا[۶۴] عہد شاہجہانی میں علم ہیئت کے ایک ماہر ملا فرید منجم نے ایک زیچ (Astronomical Table) مرتب کی جو بادشاہ کے نام پر "زیچ شاہجہانی" کے نام سے معروف ہوئی[۶۵] فیروز شاہ تغلق نے ایک اصطرلاب (جو علم ہیئت کے میدان میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تحقیق و تجربہ کا سب سے مفید آلہ تھا) تیار کرا کے دہلی میں منارہ فیروز شاہی میں نصب کرایا تھا[۶۶] ہمایوں نے اصطرلاب کے ساتھ ساتھ ایک رصدگاہ کی تعمیر کا بھی منصوبہ بنایا تھا اور اس کے لیے ضروری آلات بھی فراہم کر لیے تھے لیکن اس کے کچھ ہی عرصہ بعد انتقال کر جانے کی وجہ سے یہ منصوبہ مکمل نہ ہوسکا[۶۷] اس عہد میں جو شفاخانے یا اسپتال قائم کیے گئے تھے وہ نہ صرف علاج و معالجہ کی سہولتیں مہیا کرتے تھے بلکہ وہاں طلبہ کے لیے طب کے مختلف پہلوؤں پر لکچرس و عملی تجربہ کا بھی اہتمام ہوتا تھا اور اس کے لیے ماہر اطباء کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ اس عہد کے متعدد ماہرین طب کے بارے میں یہ ثبوت ملتا ہے کہ طبابت کے ساتھ ساتھ وہ طب کی تدریس کا مشغلہ بھی رکھتے تھے[۶۸]

اوپر کے مباحث سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا صرف ایک ذریعہ (مدرسہ) نہ تھا بلکہ اس کے مختلف ذرائع تھے جن میں سب سے زیادہ اہمیت علماء و فضلاء یا مختلف فنون کے اساتذہ کے انفرادی مراکز کو حاصل تھی یہ مراکز عام طور پر کسی نہ کسی خاص مضمون میں درس کے لیے معروف ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ جو شائقین علم مختلف مضامین میں اعلیٰ تعلیم یا اختصاص حاصل کرنا چاہتے تھے وہ مختلف انفرادی مراکز تدریس سے رجوع کرتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت بہت سے مدارس میں ایک عام انداز میں مختلف علوم و فنون کے میدان میں تعلیم کا اہتمام تھا لیکن جہاں تک کسی خاص مضمون یا فن میں حصول مہارت کا تعلق ہے اس کے لیے اُن فنون کے اساتذہ و شیوخ سے استفادہ کرنے، ذاتی مطالعہ و تحقیق کے ذریعہ ان سے متعلق اپنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے اور بعض سائنسی مضامین کے ضمن میں ان کے تحقیق و تجرباتی مراکز سے رجوع کرنے کا طریقہ معمول بہ تھا۔ شاذ و نادر ہی ایسی مثال ملے گی کہ کسی ایک مدرسہ یا انفرادی مرکز سے مستفید ہو کر کوئی شخص مختلف علوم و فنون یا علوم نقلیہ و عقلیہ کا ماہر بن گیا ہو۔ بلکہ تعلیم کے مختلف ذرائع اختیار کرنے کے بعد ہی یہ جامعیت نصیب ہوتی تھی، اس لیے موجودہ دور میں مدارس کے طلبہ سے یہ بیجا توقع نہیں کی جانی چاہیے کہ وہ مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہو کر اسلامی علوم کے ماہر و فاضل بن کر نکلیں گے اور ساتھ ہی سماجی و سائنسی علوم کے میدان میں بھی آفتاب و ماہتاب ثابت ہوں گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حواشی ومراجع

۱؎ عہد اسلامی کے ہندوستان سے متعلق اس نوع کی مرحلہ وار تقسیم کے لیے ملاحظہ فرمائیں، پروفیسر سعید احمد رفیق' اسلامی نظام تعلیم، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی ۱۹۵۶ء، ص ۵۵، ۵۶، ۲۶۴ -

۲؎ میر خورد کرمانی، سیر الاولیا، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۱، بعض کتابوں میں اسی (فضل) معنی میں ایک دوسرا لفظ "منتہیانہ" بھی استعمال کیا گیا ہے (عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ، ۱۸۶۹ء ۳۲۴/۱، ۶۷/۳)

۳؎ سیر الاولیا، ص ۲۹۵، امیر حسن سجزی، فوائد الفواد، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۱۵، ۲۷، ۱۱۱، ۱۱۴، ۱۵۲، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، مطبع مجتبائی، ۱۳۲۲ھ، ص ۶۷، ۸۰-۸۱، ۹۸-۹۹، ۱۴۴، ۱۵۰

۴؎ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۴۴ء ۱۳۶/۱-۱۴۰، ۲۹۹-۳۰۰، ۳۰۷، ۳۰۹

۵؎ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مدارس کے قیام وانصرام کی بابت تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔ ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۷۱ء سید عبدالحیٔ، ہندوستان اسلامی عہد میں (جنۃ المشرق ومطلع النور المشرق کا اردو ترجمہ از شمس تبریز خاں) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۷۳ء ص ۱۵۳-۱۸۹۔ N. N. Law, Promotion of Learning in India during Muhammadan Rule, Delhi 1973

۶؎ ابوالعباس القلقشندی، صبح الاعشیٰ، مطبع امیریہ، قاہرہ ۱۹۱۵ء ۶۹/۵، شہاب الدین العمری مسالک الابصار (انگریزی ترجمہ: اٹو اسپیس) علی گڑھ، ۱۹۴۳ء ص ۲۴

۷؎ نظام الدین احمد بخشی، طبقات اکبری، کلکتہ ۱۹۲۷ء ۲۴۱/۱، محمد قاسم ہندوشاہ فرشتہ، تاریخ فرشتہ مطبع نول کشور (بدون تاریخ) ۱۵۱/۱، نیز دیکھئے سیرت فیروز شاہی، نقل (مخطوطہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ) یونیورسٹی کلکشن (مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) ع ۱۱۱، ص ۱۲۷، ۲۰۹

۸؎ سیرت فیروز شاہی، ص ۱۲۷، ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۶۲ء ص ۵۶۴

۹؎ ڈاکٹر وحید مرزا، دیوان مظہر کڑہ، اورینٹل کالج میگزین (لاہور) ۳/۱۱ مئی ۱۹۳۵ء، ص ۱۳۷

۱۰؎ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۵۶۵-۵۶۶

۱۱؎ رحلہ ابن بطوطہ، مطبعہ ازہریہ، مصر ۱۹۲۸ء ۲/۴۴ شہاب الدین العمری، مسالک الابصار (انگریزی ترجمہ) ص ۴۲، ۴۳

۱۲؎ غلام علی آزاد بلگرامی، مآثر الکرام، ص ۱۸۴، ۱۸۵، اخبار الاخیار، ص ۱۴۴، رحمان علی خاں، تذکرۂ علماء ہند،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نولکشور، ۱۹۱۴ء، ص ۲۲۸-۲۲۹

۱۳۔ قدیم اسلامی درس گاہیں، ص ۳۱-۳۲

۱۴۔ برنی، تاریخ فیروز شاہی، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء حصہ اول ص ۸۰-۸۱، شبلی نعمانی، شعر العجم، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء، ۲/ ۳۵، این، این لا، محولہ بالا، ص ۲۶

۱۵۔ عبد الحمید لاہوری، بادشاہ نامہ، کلکتہ ۱۸۶۷ء جلد اول حصہ دوم، ص ۳۴۰، محمد صالح کمبو لاہوری عمل صالح کلکتہ ۱۹۳۹ء، ۳/ ۳۸۹، نزہتہ الخواطر، ۵/ ۳۸۴، ریاست علی ندوی، عہد اسلامی کا ہندوستان پٹنہ، ۱۹۵۰ء، ص ۲۸۱

۱۶۔ آثر الکرام، ص ۲۲۱-۲۲۲

۱۷۔ غلام علی آزاد بلگرامی، سبحۃ المرجان، (تحقیق محمد فضل الرحمٰن الندوی) علی گڑھ، ۱۹۷۶ء ۷۰-۷۲ تذکرہ علماء ہند ص ۴۸، عبد الحئی الحسنی، نزہتہ الخواطر، حیدر آباد ۱۹۴۷ء ۱۰/ ۱۳۷-۱۴۱-۱۴۱۔ سید حسن برنی، امام صغانی، معارف ۲۴۰/ ۱ جولائی ۱۹۲۹ء ص ۴-۱۳

۱۸۔ نزہتہ الخواطر، ۲/ ۱۴۲-۱۴۳، محمد اسحاق بھٹی، فقہائے ہند، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۷۴ء ص ۲۸۵-۲۸۶

۱۹۔ تاریخ فرشتہ، ۲/ ۴۰۴۔ نزہتہ الخواطر، ۱/ ۱۵۷، فقہاء ہند ۱۴۰-۱۴۱ محمد اسحاق، علم حدیث میں برعظیم پاک و ہند کا حصہ ۱۹۸۳ء۔ ص ۷۶-۷۷

۲۰۔ نزہتہ الخواطر، ۲/ ۱۶۱، فقہائے ہند، ص ۳۰۰

۲۱۔ نزہتہ الخواطر، ۲/ ۹۵-۹۶

۲۲۔ اخبار الاخیار، ص ۱۴۱-۱۴۳، نزہتہ الخواطر ۲/ ۲۸-۳۵، سراج الہدایہ (مرتبہ قاضی سجاد حسین) نئی دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۴-۵ (پیش لفظ)

۲۳۔ بدایونی، ۱/ ۳۲۳-۳۲۴، آثر الکرام، ص ۱۹۱-۱۹۲ تذکرہ علماء ہند، ص ۱۰۱، ۱۳۹-۱۴۰ مولانا ابو العرفان ندوی نے اپنے ایک مضمون میں ملا عزیز اللہ و ملا عبد اللہ تلنبی کے ایران جا کر علوم عقلیہ کے حصول کا ذکر کیا ہے لیکن کسی معاصر ماخذ میں یہ حوالہ نہ مل سکا۔ ملاحظہ فرمائیں دینی مدارس اور ان کے مسائل (مقالات سمینار) ادارہ علمیہ، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ۔ ۱۹۹۰ء ص ۸۰

۲۴۔ سیر الاولیاء، ص ۲۱۵، نزہتہ الخواطر، ۲/ ۱۱۳، فقہاء ہند، ص ۲۷۰-۲۷۱ ۱۹۹۰ء، ص ۸۰

۲۵۔ نزہتہ الخواطر، ۲/ ۸۰، فقہاء ہند، ص ۲۴۲-۲۴۳

۲۶۔ نزہتہ الخواطر، ۲/ ۱۸

۲۷۔ تذکرہ علماء ہند، ص ۱۵۴، آثر الکرام، ص ۱۶۱

۲۸۔ اُس وقت کی اصطلاح میں نقد عطیہ کو "وظیفہ" یا "انعام" اور آراضی کے عطیہ کو "مدد معاش"

© rasailojaraid.com

کہا جاتا تھا تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں ابوالفضل، آئینِ اکبری، کلکتہ ۱۸۶۷ء، ۱/ ۱۹۸ - ۱۹۹
یوسف میرک، مظہرِ شاہجہانی، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد (سندھ) ۱۹۶۲ء، ص ۱۲۱- ۱۹۰-۱۹۲

Rafat M. Bilgrami, Religious and Quasi-Religious Departments of the Mughal Period, New Delhi 1984 P.P. 59-66

۲۹۔ سیرت فیروز شاہی، ص ۱۲۷، برنی، ۳۸۲، ۴۳۵، ۵۵۸ - ۵۶۰، ۵۶۳، مرآت احمدی ۱/ ۲۵۸، ۳۰۳، قوانینِ سلاطین (مرتبہ بشیر احمد) علی گڑھ، ص ۹۳، محمد کاظم، عالمگیر نامہ، کلکتہ ۱۸۶۷ء ۲/ ۱۰۸۵ - ۱۰۸۶، ساقی مستعد خاں، عالمگیر نامہ، کلکتہ، ۱۸۷۱ء ص ۵۲۹، بایزید بیات، تاریخ ہمایوں واکبر کلکتہ، ۱۹۴۱ء ص ۳۱۰- ۳۱۱، عہد اسلامی کا ہندوستان، ص ۲۸۴- ۲۸۵۔ سعید احمد رفیق، ص ۲۴- ۲۵

۳۰۔ مآثر الکرام ص ۱۵۲

۳۱۔ سیر الاولیاء، ص ۲۸۵۔ اخبار الاخیار ص ۹۳ تذکرہ علماء ہند ص ۸۶، ۱۴۰، نزہتہ الخواطر، ۲/ ۸۰ - ۱۰۸، ۱۷۷، ۱۴۴ سبحۃ المرجان ص ۱۷۲

۳۲۔ نزہتہ الخواطر، ۲/ ۷۰، فقہاء ہند، ص ۲۳۸- ۲۳۹

۳۳۔ فوائد الفواد، ص ۱۱۵- ۱۱۶۔ اخبار الاخیار، ص ۸۷، تذکرہ علماء ہند، ص ۲۴

۳۴۔ تاریخ فرشتہ ۱/ ۳۰۸، این این لا، ص ۸۴- ۸۵

۳۵۔ شاہنواز خاں، مآثر الامراء، کلکتہ، ۱۸۹۱ء ۳۰/ ۶۹- ۷۴

۳۶۔ بدایونی ۱۳۰/ ۱۵۴- ۱۵۵، مآثر الکرام، ص ۲۳۷- ۲۳۸، تذکرہ علماء ہند، ص ۱۶۰

۳۷۔ برنی، ص ۵۶۵، نزہتہ الخواطر، ۲/ ۱۷۳، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص ۲۳

۳۸۔ سیر الاولیاء، ص ۲۷۸- ۲۷۹، فقہاء ہند، ص ۲۵۷، سید سلیمان ندوی نے ذکر کیا ہے کہ شیخ نظام الدین اولیا کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے بعد مولانا فخر الدین زرادی نے درس و تدریس کا سلسلہ ترک کردیا تھا (مقالات سلیمان، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۶۸ء ۲۰/ ۳۲) اور صاحب سیر الاولیاء کے بیان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہا۔

۳۹۔ اخبار الاخیار، ص ۱۸۵- ۱۸۶، تذکرہ علماء ہند، ص ۱۰۰، محمد غوثی شطاری گلزار ابرار (اردو ترجمہ) لاہور ۱۳۹۵ھ، ص ۱۱۴- ۱۱۵، نیز دیکھئے تذکرہ علماء ہند، ص ۱۲۰- ۱۲۱، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ۲/ ۱۲۰

۴۰۔ بدایونی ۱/ ۳۲۸، ۴۳، ۷۵، ۱۲۹، اخبار الاخیار، ص ۲۵۱- ۲۵۲، محمد اسحاق، محولہ بالا ص ۱۲۳- ۱۲۵

۴۱۔ مآثر الکرام، ص ۱۵۱

۴۲۔ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۵۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۳۔ یحییٰ بن احمد سرہندی، تاریخ مبارک شاہی، کلکتہ ۱۹۳۱ء، ص ۶۵-۶۶۔

۴۴۔ عصامی، فتوح السلاطین، مدراس، ۱۹۴۸ء، ص ۱۱۸

۴۵۔ عبداللہ داؤدی، تاریخ داؤدی (تصحیح پروفیسر عبدالرشید) علی گڑھ (بدون تاریخ) ص ۲۹-۳۰

۴۶۔ شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۹۱ء ص ۲۸۲-۲۸۳

۴۷۔ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۲۹-۱۳۰ ۴۸۔ عفیف، ص ۳۷۹-۳۸۲، فتوحات فیروز شاہی (تصحیح پروفیسر عبدالرشید) علی گڑھ، ص ۸-۱۰ تاریخ داؤدی، ص ۵۹-۶۰، طبقات اکبری، ص ۱۶۳-۱۶۴

۴۹۔ گلزار ابرار، ص ۷۴-۷۵۔ ۵۰۔ مآثر الامراء، ۳۰/۲-۳۲ ۵۱۔ سیر الاولیاء، ص ۳۲۷

۵۲۔ نزہۃ الخواطر ۲۶/۲ ۵۳۔ مآثر الکرام ص ۲۲۸، ۲۲۵، ۲۲۹ ۵۴۔ مآثر الکرام ص ۵۳۔ اخبار الاخیار ص ۲۸۲-۲۸۳

۵۵۔ مآثر الکرام، ص ۱۹۷-۱۹۸ نیز دیکھئے اخبار الاخیار ص ۲۵ ۵۶۔ فوائد الفواد، ص ۴۵ وراق و نساخ کے بارے میں تفصیل کے لیے دیکھئے ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، محولہ بالا، ص ۵۱-۵۲

۵۷۔ سعید احمد رفیق، ص ۲۵، ۳۴ Abdul Aziz, the Imperial Library of the Mughals -Delhi 1974

۵۸۔ توزک جہانگیری، علی گڑھ، ۱۸۶۴ء، ص ۲۱۸ ۵۹۔ اخبار الاخیار، ص ۱۸۷، ۲۵۰، مآثر الکرام، ص ۲۶۵

۶۰۔ مآثر الکرام ص ۲۶۵ ۶۱۔ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۹۲، محمد کاظم، عالمگیر نامہ کلکتہ، ۱۸۶۸ء، ۱۰۸۶/۳ - ۱۰۸۷۔ ساقی مستعد خاں، مآثر عالمگیری، کلکتہ، ۱۸۷۱ء، ص ۲۲۹-۲۳۰ نیز دیکھئے ریاست علی ندوی "کچھ فتاوائے تاتارخانی کے بارے میں" معارف، ۳/۵۹، مارچ ۱۹۴۷ء، ص ۱۶۵-۱۸۰ مجیب اللہ ندوی، فتاوائے عالمگیری اور اس کے مولفین، مرکز تحقیق، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور (بدون تاریخ)

۶۲۔ عفیف، ص ۳۹۲ ۶۳۔ نزہۃ الخواطر، ۴۶/۲ تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔ سید سلیمان ندوی، "ہندوستان میں کتب حدیث کی نایابی کے بعض واقعات" مقالات سلیمان، مطبع معارف ۱۹۶۸ء ۷۶/۲-۷۸ محمد اسحاق، علم حدیث میں برعظیم پاک و ہند کا حصہ، ص ۷۶-۷۷، ۸۷-۹۰، ۹۵-۹۸ فقہائے ہند، ص ۲۸۰، ۲۸۵، محمد اعجاز حسن خاں، "تیموری عہد سے پہلے ہندوستان میں علم حدیث کا رواج"۔ معارف، ۲۴/۴، اکتوبر ۱۹۲۹ء ص ۲۵۰-۲۵۲

۶۴۔ سید سلیمان ندوی، مقالات سلیمان (مقالہ: اسلامی رصد خانے) ۲۶۲/۲-۲۶۴، این این لا، ص ۸۵، نیز دیکھئے تاریخ فرشتہ، ۳۰۷/۱-۳۰۸، ۳۱۶، مآثر الکرام، ص ۲۰۲۔

۶۵۔ عمل صالح، ۳۶۱/۱-۳۶۲ ۶۶۔ سیرت فیروز شاہی، ص ۲۹۳-۲۹۴

۶۷۔ خواند میر، قانون ہمایونی، کلکتہ، ۱۹۴۰ء، ص ۶۸-۶۹، ۱۱۰-۱۱۲، ابوالفضل، اکبر نامہ، کلکتہ ۱۸۷۷ء، ۳۶۸/۱ مقالات سلیمان ۲۶۳/۲ ۶۸۔ نزہۃ الخواطر، ۱۴/۲، ۱۶، ۶۱، ۶۶۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۳، ۵۱۰ مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے حکیم الطاف احمد اعظمی، تاریخ طب و اطباء دور مغلیہ، جامعہ ہمدرد دہلی، ۱۹۹۲ء۔

© rasailojaraid.com